علوم قدیمہ کا تحفظ

از

جناب مولوی مرزا محمد یوسف صاحب استاذ عربی گورنمنٹ مدرسہ عالیہ رام پور

زیرِ نظر مقالہ اس خیال سے شائع کیا جا رہا ہے کہ اس تقریب سے اصلاحِ نصاب کے مسئلے پر اُن اصحابِ علم کو بھی کچھ کہنے کا موقع مل جائے گا جو فاضل مقالہ نگار کے طریقِ فکر سے اتفاق نہیں رکھتے۔

مضمون میں علومِ قدیمہ کے تحفظ اور درسِ نظامی کے درمیان جس طرح کا ربط ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ بہت کچھ محلِ نظر ہے اور ہر گز ضروری نہیں ہے کہ مدارس عربیہ کے موجودہ جامد و خامد نصاب میں اصلاح و ترمیم کے بعد علومِ قدیمہ کے قابل حفاظت حصے کا تحفظ نہ ہو سکے، بہر حال اس موضوع سے متعلق مختصر اور جامع مقالات کے لئے "برہان" کے صفحات کھلے ہوئے ہیں۔ "برہان"

مدارس عربیہ کی اصلاح اور اُن کے نصاب پر نظرِ ثانی کا مسئلہ عرصے سے بہی خواہانِ ملت کا موضوعِ فکر رہا ہے۔ ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ اصلاح ہوتی ہی رہی ہے۔ آخر "درس نظامی" کی ابتدا بھی تو ملا نظام الدین کے ایک اصلاحی اقدام ہی کا نتیجہ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کل کی اصلاح قدیم اصلاحوں سے بنیادی طور پر مختلف ہو گی۔ پہلے زمانے میں ملک کے عام تعلیمی نظام میں مدارس عربیہ ہی کی ریاست تھی۔ آج یہ کیفیت بدل گئی ہے، یہاں تک کہ بعض مصلحین کے نزدیک تو یہ ایک دقیانوسی نظام ہے جسے بدلے ہوئے حالات میں ختم ہو جانا چاہئے (حالاں کہ یہ مایوسی بھی اتنی ہی غلط ہے جتنی گزشتہ صدی کی ہٹ دھرمی) اس کی وجہ حسب ذیل ہے۔

تعلیم معاشرتی نظام کے تابع ہوا کرتی ہے بالخصوص عمومی تعلیم ملک کی سیاسی و اقتصادی تنظیم میں رئیس نہیں بلکہ مرؤس ہوا کرتی ہے مسلمانوں کو اپنے عہد حکومت میں اپنی حکومتی مشینری چلانے کے لئے خاص قسم کے کاری گر درکار تھے۔ سماجی نظام اسلامی تھا اور اس کی مخصوص اقدار حیات تھیں اس لئے تعلیم اور نصاب کا ایک خاص انداز رہا۔ آخری مغل تاج داروں کے عہد میں طوائف الملوکی اور انتشار نے ملک کا جو معاشرتی مزاج بنا دیا تھا اُس کے لئے قدیم نظامِ تعلیم

میں تبدیلی کی ضرورت تھی، وہ ملا نظام الدین نے پوری کی۔ انگریزوں کے زمانے میں حکمرانوں کو ایک خاص قسم کے کل پرزے درکار تھے لہٰذا اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اُسی نہج پر بنیں اور اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے اس مخصوص نظام کو چلانے میں حکمرانوں کا بہت اچھی طرح ہاتھ بٹایا۔ آزادی کے بعد معاشی و معاشرتی رجحانات بدل گئے ہیں اس لئے تعلیم کے متعلق بنیادی نظریات بھی بدل رہے ہیں اور ان بنیادی تبدیلیوں کا اثر تعلیمی نظام اور نصاب پر بھی پڑنا ناگزیر ہے اس کی تفصیل کا میں اہل نہیں اور نہ یہ میرے موضوع کے تحت آتی ہیں۔

انگریزوں کے عہد میں اگرچہ غدر نے مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ دی تھی پھر بھی ان کی حیثیتِ قومی نے اپنی قدیم تہذیب و ثقافت کے برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ پچھلی صدی میں قدامت و جدت کی کشمکش اور انگریزی تعلیم کی حرمت اور اس کے باوجود اس کی مقبولیت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں۔ اس کشاکش میں مدارس عربیہ نے اپنے وجود ہی پر اصرار نہیں کیا بلکہ وہ اس پر بھی مصر رہے کہ ملک کی عام تعلیمی ضرورتوں کے پورا کرنے کے ہم وار ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے یہاں نئی ضرورتوں کی تکمیل کا تو انتظام نہیں کیا البتہ نئی ضرورتوں کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے اس میں اُن کو کہاں تک کامیابی ہو سکتی تھی۔

بیسویں صدی شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ عربی مدارس نے اپنی ہزیمت کو محسوس کیا۔ جنگ عظیم اور جنگ اعظم نے اس احساس میں شدت پیدا کی اور پچھلی صدی کے افراط کے ردِ عمل کے نتیجے میں ایک "نومیدی و مایوسی جاوید" کی کیفیت پیدا ہونے لگی اس کیفیت کا اظہار کہیں مصلحین کے اندر عربی مدارس سے بیزاری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کہیں اُن کے اندر انقلابی تبدیلیوں کے مطالبے کی صورت میں لیکن نہ پچھلی صدی کا اصرارِ بے جا مستحسن تھا اور یہ قنوطیت و تشاؤم پسندی ہی قابلِ ستائش ہے۔

اس سلسلے میں ایک اصولی حقیقت عموماً نظر انداز کر دی جاتی ہے ہر چند کہ معاشرتی ہیئت ترکیبی کے نتیجے میں عمومی تعلیم کا ایک خاص نظام پیدا ہونا فطری ہے مگر ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے

عمومی تعلیم کے علاوہ اپنے افقِ ذہنی میں وسعت پیدا کرنا بھی ضروری ہے یعنی ملک کا ہر قسم کی معلومات سے آشنا رہنا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ملک کا ہر متعلم تمام عمومی و خصوصی مضامین سے واقف ہو۔ تمام خصوصی مضامین سے آشنائی تو درکنار تمام عمومی مضامین سے واقفیت بھی تکلیف مالایطاق ہے۔ یورپ اتنا ترقی یافتہ ہے پھر بھی وہاں سب طالب علم بی ایس سی نہیں ہوتے بہت سے بی اے ہوتے ہیں یعنی سائنس جو یورپ کے مخصوص حالات کے پیش نظر وہاں عمومیت کا درجہ رکھتی ہے، اُس سے اکثر طلبہ ناآشنا رہتے ہیں یا اتنے آشنا نہیں ہوتے جتنے اُن کے بی ایس سی ہم جماعت۔ جب تمام عمومی مضامین سے آشنائی ہر متعلم کے لئے ناگزیر و لابدی نہیں قرار دی جاسکتی تو جملہ خصوصی مضامین سے اُن کی واقفیت کا کیا سوال۔ لہٰذا خصوصی مضامین سے آشنائی صرف مخصوص طبقہ تک رہنا ضروری ہے۔ ہم اپنی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ترقی یافتہ ملک کے لئے ہر خصوصی مضمون سے آشنائی فرض کفایہ ہے۔

مضامین تعلیم کے اس انتباز کے بعد عربی مدارس کی حالیہ تاریخ پر پھر ایک نظر ڈالئے۔ زندگی کی اس دوڑ میں انھیں جو ہزیمت ہوئی اُس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو مضامین مدارسِ عربیہ میں پڑھائے جاتے ہیں آج اُن کی نوعیت "خصوصی مضامین" کی ہے۔

لیکن چوں کہ ہمارا ملک ایک ترقی یافتہ ملک ہے اس لئے اس میں ان خصوصی مضامین کی تعلیم کا انتظام رہنا چاہئے۔ رہا یہ مسئلہ کہ اس انتظام کی کیا شکل ہونا چاہئے یہ خصوصی مضامین کی نوعیت پر موقوف ہے جس کی تفصیل یہ ہے

خصوصی مضامین کی مختلف نوعیتیں ہیں:

اولاً وہ خصوصی مضامین جن کی سماج من حیث الکل کو ضرورت ہے لیکن ہر فرد اُس میں کمال حاصل نہیں کرسکتا جیسے پرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے استعمال کے سلسلے میں تحقیقات، یا جن کی سماج کی اکثریت میں قدر ہے اگرچہ ہر فرد سے اُس میں تبحر کی توقع نہیں کی جاتی مثلاً فوٹو گرافی۔

دوسرے وہ خصوصی مضامین جن کی سماج من حیث الکل کو ضرورت نہیں ہے صرف اُس کا ایک حصہ اُس کا حاجتمند ہے مثلاً دینیات یا دھرم شاستر کی تعلیم، اول الذکر صرف مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے۔

تیسرے وہ خصوصی مضامین جو تاریخ کے کسی دور میں بہت مقبول تھے اور بہ نظرِ عزت دیکھے جاتے تھے اُنھیں بھی ذہنی جستجو کی تشفی کے لئے برقرار رہنا چاہئے۔ اگرچہ ان کے متخصصین کی تعداد بھی کم ہوگی۔ ان تیسرے قسم کے مضامین کی چند قسمیں ہیں

(الف) وہ مضامین جو سوسائیٹی کے لئے مضر ہیں مثلاً سحر جادو کہانت وغیرہ۔

(ب) وہ مضامین جو سوسائیٹی کے لئے مضر تو نہیں ہیں مگر ان کی ضرورت بھی نہیں ہے مثلاً امم بائدہ کی لسانیات

(ج) وہ مضامین جو کسی زمانے میں مفید تھے مگر جنھوں نے ترقی کرکے اب موجودہ عمومی مضامین کی شکل اختیار کرلی ہے مثلاً یونان کی ریاضی و ہیئت مسلمانوں کا فلسفہ وغیرہ

عربی مدارس کے زیرِ درس مضامین تینوں قسموں کے تحت میں آتے ہیں۔ کیوں کہ درسِ نظامی کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

لسانیات، دینیات، معقولات۔

۱۔ ہندوستان جیسے ملک کو جو بین الاقوامی سیاسی توازن میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے باہر کے ہر ملک سے بالخصوص مشرقِ وسطیٰ سے ثقافتی تعلقات کے علاوہ ڈپلومیٹک تعلقات رکھنا ناگزیر ہیں۔ اس کے لئے ان ممالک کی زبان، کلچر اور قدیم تاریخ سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر کاشتکار اور مشین کار کے لئے سفارتی اداروں میں جانا ضروری نہیں ہے اس لئے چالیس کروڑ کی آبادی کو مصر و شام کی زبان، کلچر اور تاریخ کے مطالعے کی نہ ضرورت ہے نہ فرصت۔ لیکن بہرحال ملکی انتظام اور قومی وقار کے لئے ضروری ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں ہمارے سفارت خانے زیادہ سے زیادہ عظیم الشان پیمانے پر قائم ہوں اور انھیں چلانے

کے لئے ہمیں ایسے افراد پیدا کرنا ہیں جو عربی زبان مسلمانی کلچر اور اسلامی تاریخ کے خصوصی ماہر ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان خصوصی مضامین میں زیادہ مہارت تامہ رکھتے ہوں بہ مقابلہ ملک کی درس گاہوں کے عمومی مضامین کے کیوں کہ جن اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے وہ وہاں بھیجے جاتے ہیں اُن کی تکمیل بغیر ان خصوصی مضامین کے ناممکن ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مصر میں ہندوستانی قونصل خانہ کا ایک فرد حساب و ہندسہ سے ناآشنا ہو یا ہندی میں کچا ہو اور پھر بھی وہ اپنے فرائض منصبہ کو ادا کرسکے لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ عربی زبان سے ناآشنا ہو (ورنہ وہ وہاں کے باشندوں کی بات نہیں سمجھ سکے گا) یا مسلم کلچر سے ناواقف ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کو شریعت اسلامیہ پر عمل کرتے دیکھ کر استعجاب یا ازدراء کا اظہار کرے اور اس طرح مودت کے بجائے منافرت کا موجب بن جائے) یا اسلامی تاریخ پر عبور نہ رکھتا ہو (ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی قدیم تاریخ کے سلسلے میں کوئی مضحکہ خیز بات کہدے اور اس طرح ہماری قومی جہالت کے طعنہ کا سبب بن جائے)

اس تفصیل سے واضح ہوگیا کہ اس قسم کے اہم فرائض کی ادائیگی کے لئے عربی مدارس کے طلبہ زیادہ خوش سلیقہ ثابت ہوسکتے ہیں اگرچہ وہ عمومی مضامین سے زیادہ واقف نہ ہوں۔

۲۔ ہندوستانی سماج کے ایک اہم طبقے کو ہر چند کہ اقلیت میں ہے لیکن بہرحال ایک اہم اقلیت ہے اپنے بچوں کی دینی تعلیم ضرور دلواتا ہے۔ یہ تعلیم اُس کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی سماج من حیث الکل کے لئے عمومی مضامین کی۔ اس لئے ایسے افراد کی تربیت ضروری ہے جو اس فریضے سے کماحقہ عہدہ برآ ہوسکیں۔ ظاہر ہے یہ مقدس فریضہ صرف عربی مدارس کے طلبہ ہی انجام دے سکتے ہیں۔

۳۔ تیسری قسم کے خصوصی مضامین میں سے جہاں تک (الف) کا تعلق ہے عربی مدارس کے نصاب میں اس قسم کا کوئی مضمون ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جہاں تک (ب) کا تعلق ہے اُن کے یہاں "قرون خالیہ" کی "السنہ" کی مدیں ہی کچھ نہیں ہے ہاں جہاں تک (ج) کا تعلق ہے

متداول درس کا ایک اہم حصہ اس قسم کے مضامین پر مشتمل ہے اس سلسلے میں پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کے مضامین کی تعلیم و تخصص کا کیا طریقہ ہے۔ عموماً وہاں ان مضامین کی تعلیم یا تو عام تعلیمی درس گاہوں میں ہوتی ہے یا خصوصی مدارس میں عام تعلیمی درسگاہوں کے ابتدائی مدارج میں طالب علم صرف عمومی مضامین ہی پڑھتا ہے۔ جامعی تعلیم کے ابتدائی سالوں میں ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے کسی خصوصی مضمون (مثلاً اسلامیات) کے مبادی کو لے لیتا ہے، بیچ کے سالوں (ایم اے) میں اس کا مستقل مطالعہ کرتا ہے اور آخری سالوں (ڈاکٹریٹ) میں اس کے کسی مخصوص پہلو پر تخصص کرتا ہے خصوصی مدارس عموماً تعلیم کے آخری مراحل پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں وہی طالب علم داخل ہو سکتے ہیں جنھوں نے عمومی مضامین میں ثانوی تعلیم حاصل کی ہو۔ باقی تشکیل عمومی درس گاہوں کی سی ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں بعض یونیورسٹیوں نے (رج) کا بعنوان اسلامیات انتظام کیا ہے مگر بلا خوف لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ ان کے متخصصین میں وسعت ہو تو ہو گہرائی نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے مثلاً جو لوگ عربی کا متداول نصاب گھر پر پڑھے نہیں ہوتے اور یونیورسٹیوں میں بی اے یا ایم اے مسلم فلاسفی میں کرتے ہیں وہ فلسفہ اور دیگر علوم میں تو ماہر ہوتے ہیں لیکن اسلامی فلسفہ میں مدارس عربیہ کے طلبار کے ہم پایہ نہیں ہوتے۔ تاریخ فلسفۂ اسلام سے وہ بھلے واقف ہوں مگر مسائلِ فلسفیہ سے زیادہ واقف نہیں ہوتے اور اگر ہم اس بات کو بھی ملحوظ رکھیں کہ مدارس عربیہ کے طلبہ کی اوسط ذہانت ان جامعی طلبہ کی ذہانت سے بدرجہا پست ہوتی ہے (جن وجوہ سے بھی ہو) تو یہ فرق اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے مثلاً فقہ کے ضمن میں ایک کامیاب وکیل ہائی کورٹ کے نظائر سے زیادہ واقف ہوتا ہے مگر فقہار کے اختلافات اور وجوہِ استدلال سے نہیں۔

اس کی یہ وجہ نہیں کہ مدارس عربیہ کے پاس جادو کی چھڑی ہوتی ہے کہ جہاں چھلایا اور طالب علم بحر العلوم ہو گیا۔ نہیں اصل وجہ "کار بکثرت" ہے۔ اُن کے نظامِ تعلیم میں انھیں مضامین

پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے مثلاً منطق ابتدائی درجات ہی سے شروع ہوتی ہے اور پھر صغریٰ سے لے کر حمد اللہ اور قاضی مبارک تک طوعاً و کرہاً پڑھنا ہی پڑتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

گرنستانی بستم می رسد

طالب علم خواہی نخواہی بہت سی ایسی باتوں سے واقف ہو جاتا ہے جو مسلم فلاسفی کے ایم اے کو بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کہ وہ تین چار سال سے زیادہ ان مضامین پر صرف نہیں کرتا۔ اس کی معکوس مثال انگریزی اور ریاضی وغیرہ ہیں۔ بعض عربی مدارس میں منتہی طلبہ انگریزی پڑھتے ہیں مگر اُن میں یقیناً وہ لیاقت نہیں آتی جو ایک جونیر اسکول کے معمولی طالب علم میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ تکمیلِ نصاب کے سلسلے میں بعض طلبا خلاصۃ الحساب پڑھتے ہیں مگر وہ تبحر حاصل نہیں ہوتا جو پرائمری اسکول کے طالب علم کو ہوتا ہے۔

اس لئے اگر عربی مدارس اسلامیات میں تفوق کا دعویٰ کریں تو اس سے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو چیں بہ جبیں نہ ہونا چاہئے یہ تو "کار بکثرت" کا فطری نتیجہ ہے۔

بہرحال ایک ترقی یافتہ اور بین الاقوامی وقار کے مستحق ملک کی حیثیت سے ہمارے ملک کو عربی زبان کلچر اور تاریخ کی تعلیم کے لئے عربی مدارس کا قائم رکھنا اشد ضروری ہے۔ اسی طرح ان علوم کو برقرار رکھنے کے لئے جنھوں نے ترقی کر کے جدید سائنس و فلسفہ کی شکل اختیار کی ہے ان مدارس کا وجود ناگزیر ہے اور یہ ایسا خیال ہے جس پر غور و فکر کرنے والے ذہن کو جلد یا بدیر پہنچنا ہے پھر جہاں تک مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا تعلق ہے ان مدارس سے بے اعتنائی یا بیزاری قومی خودکشی کے مترادف ہوگی۔

چند متعلقہ مسئلے

جب یہ امر ثابت و متحقق ہو گیا کہ ہر نقطۂ نظر سے مدارس عربیہ کی بقا ضروری ہے تو چند اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

متعلمین کا مستقبل۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ ان مدارس کا اور ان کے طلبہ کا ہماری سماجی زندگی میں کیا مقام ہے۔ بدقسمتی سے معاشرتی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور اقدار حیات ابھی تک متعین نہیں ہو پائیں۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی باتیں ایک غیر متیقن حالت میں پڑی ہوئی ہیں۔ پھر بھی اس مسئلے کو حل کرنا ہی ہوگا۔

میں نے کہا تھا کہ ان مدارس کی تین حیثیتوں سے ضرورت ہے۔ سماج کے لئے انتظامی امور کے واسطے، مسلمانوں کے لئے دینی تعلیم کے واسطے ملک کے لئے تثقیف اور اُفق ذہنی کی وسعت کے واسطے

پہلی غرض سے ان کی نگہداشت سماج من حیث الکل اور حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت مختلف قسم کے تعلیمی ادارے محض حکومتی اغراض کے لئے چلاتی ہے جن کے مصارف محض خزانۂ عامرہ ہی سے پورے کئے جاتے ہیں اور جن کے فارغ التحصیل متعلمین کے معاشی مستقبل کی ضمانت حکومت اپنے ذمہ لے لیتی ہے یہی اصول یہاں بھی کارفرما ہونا چاہیئے۔ فرق اتنا ہے کہ مروجہ خصوصی درس گاہوں میں صرف اتنے ہی طلبہ کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے جن کی حکومت کو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے ضرورت ہوتی ہے یہاں طلبہ کی تعداد پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اس لئے اصول یہ ہونا چاہیئے کہ حکومت مشرق وسطیٰ کے لئے سفارتی اغراض کے واسطے اہلکاروں کا انتخاب مدارس عربیہ کے طلبہ ہی میں سے کرے یا یہاں کے منتخبین کا ایک کوٹا مقرر ہونا چاہیئے۔ آخر انتظامی ملازمتوں کے لئے بھی تو اہلکاروں کا انتخاب جامعات ہی کے طلبہ سے ہوتا ہے۔

دوسری غرض سے ان مدارس کی نگہداشت صرف مسلمانوں ہی کے ذمہ ہے۔ انہیں اپنے بچوں کو دینی تعلیم ضرور دلوانا ہے اس لئے ایسے افراد کی تربیت کی ضرورت ہے جو اس فریضہ سے کما حقہ عہدہ برآ ہو سکیں۔ لہٰذا ایسے اداروں کی بھی ضرورت ہے جو ایسے افراد تیار کر سکیں۔ اس مسئلے کو دو نقاط نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اولاً: جو افراد عربی مدارس سے فارغ ہو کر نکلیں اُن کے لئے روزگار مہیا کرنے کے لئے مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کا دھندا تلاش کریں۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم مصنوعی تنفس کے ساتھ مدارس

عربیہ کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اصول زیادہ عرصے نہیں چل سکتا۔

ثانیاً سماج کے ایک اہم طبقہ کی مخصوص تعلیم کے لئے معلمین کی تیاری کے واسطے چند خصوصی اداروں کی ضرورت ہے اس طرح عربی مدارس خود اپنے افادی استحقاق کی بنا پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اگرچہ سوال یہاں بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ان متعلمین کا مستقبل کیا ہوگا مگر اب "طلب اور رسد" کے اصول پر اسے حل ہونا چاہیے۔ اس کے لئے پہلے احساسِ طلب میں شدّت پیدا ہونا چاہیے یعنی سماج کے ایک اہم طبقے کی تعلیم کے لئے ایک مخصوص نوع معلّمین کی ضروری ہے۔ اگر یہ شدّتِ احساس پیدا ہو جاتی ہے تو خود سماج کو اُن کا کفیل ہونا پڑے گا۔ براہِ راست یا بتوسط نمایندہ حکومت

تیسری غرض سے یہ امر مسلم ہے کہ اُن علوم قدیمہ کو برقرار رہنا ہے جن کی ترقی یافتہ شکل موجودہ سائنسی اور فلاسفی ہیں۔ اس کی دو حیثیتیں ہیں ایک ملی دوسری ثقافتی۔

ملی حیثیت سے ان کی نگہداشت اُس ملّت کا فرض ہے جس کے اسلاف نے ان علوم و فنون کی ترقی میں خون پسینہ ایک کیا ہو۔

ثقافتی حیثیت سے ملک کی نمایندہ حکومت کا فرض ہے کہ ایک ترقی یافتہ ملک میں جہاں جملہ علوم و فنون کی سرپرستی کی جاتی ہے ان علوم کی بھی سرپرستی کرے اور ان کے تحفظ و بقا کے لئے ٹرسٹ قائم کرے۔

۲۔ مدارس عربیہ کی نگہداشت: یہ مسئلہ اوپر حل ہو گیا بعض حیثیتوں سے ان کی نگہداشت کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر ہے اور بعض جہتوں سے صرف مسلمانوں پر اور بعض حیثیتوں سے دونوں پر۔ اس لئے ہر چند کہ ان کی ذمہ داری کلیتاً حکومت پر عائد نہیں ہوتی لیکن پھر بھی حکومت کو فراخ دلی سے ان کی مالی مشکلات میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

۳۔ مدارس کا انتظام: باوجود ان مدارس کی دینوی افادیت کے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس پر اصرار کرے گا کہ یہ مدارس خالصتہً لوجہ اللہ خدمت کرتے رہیں اور اسی جذبے کے ماتحت انھیں باقی رہنا چاہیے۔ یہ جذبہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے اور جو مدارس اس جذبے کے تحت چلنا چاہتے ہیں

اور اپنے مخصوص مصالح یا دیرینہ روایات کے ماتحت حکومت کی امداد سے مستغنی رہنا چاہتے ہیں وہ حسب سابق آزادانہ چلتے رہیں۔

لیکن بدلے ہوئے حالات میں سب مدارس تو حکومتی اعانت سے مستغنی نہیں رہ سکتے۔ اکثریت حکومتی امداد کی خواہاں ہے بالخصوص جب کہ ملک میں اپنی ہی حکومت قائم ہے اور حکومتی امداد ٹیکس دہندوں ہی کی بالواسطہ اعانت ہے۔ اس لئے ان کے نظم وضبط کارکردگی اور حساب کتاب کی نگہداشت کے لئے مقامی ذمہ داروں کی مشترکہ ذمہ داری ہونی چاہیئے۔ اور اس کے لئے حکومت کی بالادستی ضروری ہے اس لئے نہیں کہ حکومت اس بالادستی کے توسط سے ان مدارس کی پالیسی میں مداخلت کرسکے بلکہ اس لئے کہ بصورت فساد وانتشار اس کا ازالہ کیا جاسکے نیز ان کی جائز ضرورتیں حکومت سے پوری کرائی جاسکیں۔

۴۔ نصاب کی اصلاح: موجودہ نصاب میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ بنیادی تبدیلی سے میری مراد یہ ہے کہ بعض علوم کو عملاً نصاب سے محض اس بنا پر خارج کردیا جائے کہ ان کی افادیت ان سے زیادہ ترقی یافتہ علوم کے پیش نظر ختم ہوچکی ہے۔ اس قسم کا "مبنی بر افادیت" اصول تو عمومی درس گاہوں کی تنظیم جدید کے سلسلے میں ملحوظ رہنا چاہیئے۔ یہاں اصولی مسئلہ عملی زندگی کے لئے مفید نصاب بنانے کا نہیں ہے بلکہ اصل الاصول علوم قدیمہ کا تحفظ ہے جو ہمارے اسلاف کی ذہنی وفکری کاوشوں کا ایک بیش قیمت ورثہ ہیں۔

اس کے ساتھ متداول درس میں چند فنون اور بڑھانے ہوں گے۔ لسانیات کے سلسلے میں طلبہ کو جدید عربی سے آشنا کرانا ہے جو اس وقت ممالک عربیہ میں مستعمل ہے جو طلبہ اس کے اہل اور شائق ہوں اُن میں جدید عربی بولنے اور لکھنے کی مشق اور تاریخ ادب کے سلسلے میں ممالک عربیہ کی انیسویں بیسویں صدی مسیحی کی ادبی وثقافتی تحریکات سے واقفیت ضروری ہے۔

دینیات کے سلسلے میں عہد حاضر کی لادینی وملحدانہ نیز دیگر معاشی ومعاشرتی تحریکات کا کم از کم سرسری مطالعہ ضروری ہے تاکہ اس پس منظر میں اسلام کی افادیت ومقبولیت کو سمجھا

اور سمجھایا جاسکے۔ اس طرح ایک نئے علم کلام کی ضرورت بھی پوری ہوسکے گی۔

معقولات کے سلسلے میں اور اسی طرح جملہ علوم کے سلسلے میں اُس پس منظر کے واضح کرنے کی ضرورت ہے جس کے اندر یہ علوم وفنون ظہور میں آئے۔ سماج کی خدمات انجام دیتے رہے اور ترقی پاکر موجودہ سائنس اور فلسفہ کی شکل میں منتقل ہوئے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے

اولاً: تاریخی تعارف کے لئے عمومی تاریخ اور ہر مضمون سے متعلق اُس کی خصوصی تاریخ کا اضافہ ہونا چاہئے۔

ثانیاً: موجودہ درس نظامی اس دور کا ساختہ وپیارکردہ ہے جب کہ اسے افادی حیثیت سے بنایا گیا تھا اور اس لئے متاخرین کی شروح ومتون داخلِ درس کی گئی تھیں۔ اب چونکہ بنیادی نقطۂ نظر ہی بدل رہا ہے اور اس نصاب کے ایک معتدبہ حصے کی حیثیت افادی کے بجائے تاریخی وثقافتی قرار دی جارہی ہے تو متاخرین کی شروح ومتون کے ساتھ ساتھ متقدمین کی مصنفات بھی مناسب مقام پر داخل درس کی جائیں مثلاً فلسفہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعدیہ اور میبذی وصدرا کے ساتھ ساتھ شیخ بوعلی سینا اور فارابی وغیرہ کی مصنفات بھی شامل کی جائیں ریاضی میں تصریح وشرح چغمینی کے ساتھ ساتھ شرح تذکرہ مجسطی، قانون مسعودی اور صور الکواکب وغیرہ شامل کئے جائیں۔ اسی طرح اصولِ فقہ میں نور الانوار، توضیح تلویح اور مسلم الثبوت کے ساتھ جو آٹھویں صدی کے بعد کی تصانیف ہیں تحریر، اصول بزدوی، اصول سرخسی بھی مناسب مقام پر شامل کی جائیں کلام میں شرح عقائد نسفی کے ساتھ طوالع، محصل، التمہید للباقلانی وغیرہ داخل کی جائیں۔

لیکن اس اضافے کے ساتھ یہ اصول ملحوظ رہے کہ موجودہ درس نظامی ہر چند کہ اپنی افادیت کھو چکا ہو پھر بھی کسی نہ کسی طرح چل رہا ہے اور جس اضافہ کی میں تجویز کر رہا ہوں اس کی افادیت مشکوک ہے لہٰذا موجودہ درس کو سردست علی حالہ لازمی رہنے دیا جائے اور اضافہ مجوزہ کو بطور اختیاری مضمون داخلِ درس کیا جائے۔ دونوں کی اضافی افادیت کو زمانہ آگے چل کر متعین کردیگا فیصلے کی روشنی میں نیا نصاب متعین ہوگا۔